© rasailojaraid.com

اسلام میں انسانی حقوق کا تصور

محمد رضی الاسلام ندوی

موجودہ دور میں ''حقوقِ انسانی'' کے تصور کو کافی فروغ ملا ہے۔ حقوق انسانی کی تنظیمیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر سرگرم عمل ہیں۔ مختلف ممالک نے حقوق انسانی کمیشن قائم کر رکھے ہیں۔ جو کسی بھی فرد یا طبقہ کے بنیادی حقوق کی پامالی ہو تو فوراً اس کا نوٹس لیتے ہیں اور اس کے ازالے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ان کوششوں کے علی الرغم حق تلفیوں میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ طاقتور خواہ وہ کوئی فرد ہو یا گروہ، کوئی قوم ہو یا کوئی حکومت، اپنے سے کمزور کے حقوق غصب کرنے میں اسے کوئی باک نہیں ہوتا۔ یہ ایک اہم مظہر ہے جس کے اسباب کا پتا لگانے اور ان کا تدارک کرنے کے لیے دانشور حضرات کو غور کرنا چاہیے۔

مغرب میں حقوق انسانی کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر

حقوقِ انسانی کے سلسلے میں یہ بیداری اصلاً مغرب کی دین ہے، کئی صدیوں کی جدوجہد کے بعد مغرب میں حقوق انسانی کا موجودہ تصور اُبھرا ہے اور اس کے زیرِ اثر پوری دنیا میں عام ہوا ہے۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں حقوق انسانی کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے اور اس کے پس منظر سے آگاہی حاصل کرلی جائے۔

مغرب میں حقوقِ انسانی کی جدوجہد کا آغاز اگرچہ سترہویں صدی عیسوی سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں مختلف اوقات میں بعض منشور اور قوانین منظور کیے گئے تھے، ۱۰۳۷ء میں برطانیہ میں کونارڈ دوم (Conrad II) کے ذریعے پارلیمنٹ کے اختیارات کے تعیین کے لیے جاری کیا جانے والا منشور، ۱۱۸۸ء میں شاہ الفانسو نہم (Alfonso IX) کے ذریعہ منظور ہونے والا حبسِ بے جا کا قانون، ۱۲۲۵ء میں برطانیہ میں میکنا کارٹا (Magna

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Carta) کے نام سے جاری ہونے والا بنیادی حقوق اور آزادی کا منشور اور ۱۳۵۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے منظور ہونے والا قانونی چارہ جوئی کا حق (Due Process of Law) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن سترہویں صدی سے اس جدوجہد میں تیزی آئی، چنانچہ ۱۶۷۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے حبسِ بے جا کا قانون منظور کیا جس نے عام شہریوں کو بلا جواز گرفتاری سے تحفظ فراہم کیا، ۱۶۸۹ء میں اس نے ''قانونِ حقوق'' (Bill of Rights) کو منظوری دی جس کے ذریعے بادشاہت کے آمرانہ اختیارات پر قدغن لگائی گئی۔ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر قوانین کی تنفیذ و تنسیخ سے روکا گیا اور بنیادی حقوق کا تعین کر دیا گیا۔ ۱۶۹۰ء میں برطانوی مفکر جان لاک (John Locke) اور ۱۷۶۲ء میں فرانسیسی مفکر روسو (Rousseaue) نے اپنی کتابوں میں معاہدۂ عمرانی پر مدلل بحثیں کیں اور ریاست کے مقابلے میں فرد کے حقوق کی وکالت کی۔

جون ۱۷۷۶ء کو امریکی ریاست ورجینیا (Virginia) سے منشورِ حقوق جاری ہوا جس میں پریس کی آزادی، مذہب کی آزادی اور عدالتی چارہ جوئی کے حق کی ضمانت دی گئی۔ جولائی ۱۷۷۶ء میں امریکا کا اعلانِ آزادی جاری ہوا جس میں تمام انسانوں کو مساوات، تحفظِ زندگی، آزادی اور تلاشِ مسرت کے حقوق دیے گئے تھے، ستمبر ۱۷۸۷ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کا دستور تیار اور نافذ ہوا۔ اس کے تین سال بعد ۱۷۸۹ء میں اس میں اوّلین ترمیم منظور کر کے مسودۂ حقوق (Bill of Rights) کو شامل کیا گیا۔ اس مسودہ میں دس دفعات تھیں جن میں مذہبی آزادی، اظہارِ رائے، تقریر کی آزادی، پریس اور اجتماع کی آزادی دی گئی تھی بعد میں دیگر دفعات کا اضافہ کیا گیا۔ اگست ۱۷۸۹ء میں فرانس کی قومی اسمبلی نے منشورِ انسانی حقوق (Declaration of the Rights of Man) کو منظور کر کے اپنے دستور کے ابتدائی حصے میں شامل کیا۔ اس منشورِ حقوق میں بنیادی حقوق سے متعلق سترہ دفعات تھیں۔ ان میں ہر فرد کو زندگی، آزادی، مساوات، جائیداد، مذہبی آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی کا حق دیا گیا تھا اور ظلم و زیادتی، استحصال، جبری مزدوری، بغیر قانونی تقاضوں کی تکمیل کے حراست سے تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ ۱۷۹۲ء میں تھامس پین (Thomas Paine) نے اپنا مشہور کتابچہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقوقِ انسانی (The Rights of Man) شائع کیا جس نے اہلِ مغرب کے خیالات پر گہرے اثرات مرتب کیے اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کی جدوجہد کو مزید آگے بڑھایا۔

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں ریاستوں کے دستوروں میں بنیادی حقوق کی شمولیت ایک عام روایت بن گئی۔ ۱۸۶۸ء میں امریکی دستور کی چودہویں ترمیم منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ امریکا کی کوئی بھی ریاست قانونی ضابطہ کی تعمیل کیے بغیر کسی شخص کو اس کی جان، آزادی اور املاک سے محروم نہیں کرے گی اور نہ اسے قانون کا مساوی تحفظ فراہم کرنے سے انکار کرے گی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مختلف ممالک کے دستوروں میں بنیادی انسانی حقوق شامل کیے گئے، فرانس نے ۱۹۴۶ء کے دستور میں ۱۷۸۹ء کے ''منشورِ انسانی حقوق'' کو شامل کیا۔ اسی سال جاپان نے بنیادی حقوق کو دستور کا حصہ بنایا۔ ۱۹۴۷ء میں اٹلی نے اپنے دستور میں انسانی حقوق کی ضمانت دی[1]۔

بالآخر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کا ''منشورِ انسانی حقوق'' جاری ہوا۔ اس میں وہ تمام حقوق سمو دیے گئے جو مختلف یورپی ممالک کے دستوروں میں شامل تھے، یا انسانی ذہن میں آسکتے تھے۔ یہ منشور ایک تمہید اور تیس دفعات پر مشتمل ہے۔ اس دستور پر عمل درآمد کی صورتحال کا جائزہ لینے اور ان کے تحفظ یا نئے حقوق کے تعین کے لیے اپنی تجاویز پیش کرنے کے لیے ایک مستقل کمیشن برائے انسانی حقوق بھی قائم کیا گیا۔

حقوق انسانی کے مغربی تصور کی خامیاں

مغرب میں حقوقِ انسانی کی تاریخ کے اجمالی تذکرے سے چند باتیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ مغرب میں حقوقِ انسانی کا تصور انسانی شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ابھرا ہے۔ ابتدا میں بادشاہوں کو مطلق العنان حکمرانی حاصل تھی۔ ان کے اختیارات لامحدود تھے۔ ان کے مقابلے میں عوام بے بس اور مجبور تھے۔ بعد میں حکمرانوں اور عوام کے درمیان

---

[1] بنیادی حقوق، محمد صلاح الدین، (تلخیص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کشمکش کے نتیجے میں ان کے درمیان معاہدے انجام پائے، اختیارات اور حقوق کی تقسیم ہوئی اور اقتدار میں عوام کو بھی شریک کیا گیا۔ مابعد عہد میں عوام کو اقتدار کا مرکز اور سرچشمہ قرار دیا گیا اور ان کے منتخب نمائندوں کو پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی کا حق دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر حکمرانوں اور عوام کے درمیان کشمکش جوں جوں زور پکڑتی گئی اور عوام طاقتور ہوتے گئے اس کے بقدر حقوق میں بھی وسعت آتی گئی۔ کل تک جن چیزوں کا شمار ''حقوق'' میں نہیں ہوتا تھا آج ان کا شمار اس لیے حقوق میں ہونے لگا کہ عوام انہیں تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

۲۔ مغرب میں حقوقِ انسانی کے تعیّن کے لیے جو منشور جاری اور قوانین منظور کیے گئے وہ قوتِ نافذہ سے محروم ہیں۔ یعنی کوئی ایسی قوت نہیں جو کسی کو انہیں تسلیم کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکے۔ ان کی حیثیت محض خوشنما اصولوں اور اخلاقی ہدایات کی ہے جنہیں قبول کرنے کی بس تلقین کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں حقوق انسانی کی یہ تحریکیں برپا ہوئی ہیں آج وہ خود ان حقوق کی پامالی میں پیش پیش ہیں، اور کوئی نہیں جو انہیں اس سے باز رکھ سکے۔

۳۔ اہلِ مغرب کا تصورِ حقوق نیشنلزم اور نسلی امتیاز پر مبنی ہے۔ وہ اگرچہ دنیا کے تمام انسانوں کے لیے مساوی حقوق کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر عملاً اس معاملے میں اپنی قوم اور نسل اور دیگر قوموں اور نسلوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ فرانس کے منشورِ انسانی حقوق کو جب ۱۷۹۱ء کے آئین میں شامل کیا گیا تو فرانسیسی مقبوضات اور مستعمرات کو اس کے اطلاق سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ برطانوی شہریوں کو جو حقوق حاصل تھے وہ برطانیہ کی نوآبادیات میں رہنے والوں کو حاصل نہیں تھے۔ امریکا میں سیاہ فام لوگوں کو سفید فام نسل کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہیں، اس کے علاوہ بنیادی انسانی حقوق کے معاملے میں دیگر ممالک کے ساتھ امریکا کا جو رویہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

اسلام کا تصورِ انسان

اسلام نے حقوقِ انسانی کا جو تصور پیش کیا ہے وہ مغربی تصور سے زیادہ جامع ہے اور

☆این دغل دوستان کہ می بینی مگسانند گردِ شیرینی ☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے زیادہ قدیم بھی۔ اس کا یہ تصور اس کے تصورِ انسانی پر مبنی ہے۔ اسلامی تصورِ انسان کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ وحدتِ الٰہ:۔ اسلام کے نزدیک تمام انسانوں کو ایک ہستی نے پیدا کیا ہے اور وہ وہی ہے جس نے پوری کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اس نے انسانوں کو عزت وتکریم بخشی، انہیں اپنی بے پایاں نعمتوں سے نوازا اور کائنات کی تمام چیزوں کو ان کی خدمت میں لگا دیا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل:۷۰)

’’یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت دی‘‘۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (لقمان:۲۰)

’’کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں‘‘۔

۲۔ وحدتِ آدم:۔ اسلام کہتا ہے کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ وہ ایک ماں باپ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان کوئی تفریق اور کوئی اونچ نیچ نہیں۔ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں، کسی رنگ اور نسل کے ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں مگر یہ چیزیں وجہ فضیلت نہیں بن سکتیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا...... (الحجرات:۱۳)

’’لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو‘‘۔

اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الناسُ بنو آدم و خلق الله آدم من تراب[۱]۔ ''سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا''۔

۳۔ خلافت:۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور انہیں ذمہ داری دی ہے کہ وہ اس کی مرضی اور ہدایات کے مطابق اس کائنات کا نظم ونسق چلائیں۔ اس دنیا میں وہ مختارِ کُل اور اپنی مرضی کے مالک نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے پابند ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً...... (البقرة:۳۰) ''پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں''۔

اسلام میں انسانی حقوق۔ چند امتیازی پہلو

اسلام کے پیش کردہ درج بالا تصور انسان سے واضح ہو جاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کا اسلامی تصور مغرب کے تصورِ حقوق کے مقابلے میں کئی پہلوؤں سے ممتاز ہے۔

۱۔ اسلام میں انسانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ ایسے نہیں ہیں جو انہوں نے حکمرانوں سے کشمکش کے نتیجے میں بزورِ قوت حاصل کیے ہوں۔ بلکہ وہ ایسے حقوق ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہیں، اسلام میں فرد اور ریاست کے درمیان باہمی نزاع کا کوئی پس منظر نہیں ہے۔ افراد ان حقوق کے اس لیے مستحق ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کا مستحق قرار دیا ہے، اور ریاست ان کی ادائیگی، تحفظ اور نگرانی کی اس لیے پابند ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی ذمہ داری سونپی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

۱ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ حجرات

☆......پس از من گو جہان را آب گیرد......☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الامام الذی علی الناس راعٍ وھو مسئول عن رعیتہ[1]

”امام جو لوگوں پر حکمرانی کر رہا ہے وہ ان کا نگراں ہے، اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا“۔

۲ اسلام چونکہ تمام انسانوں کے درمیان مکمل مساوات کا قائل ہے اس لیے اس کے نزدیک ان حقوق سے تمام انسان بہرہ ور ہوں گے۔ اس کے نزدیک رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ، کسی اعتبار سے کوئی تفریق معتبر نہیں۔

یاایھا الناسُ الا انّ ربّکم واحدٌ وانّ اباکم واحدٌ الا لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی، ولا لاَحمرَ علی اسودَ ولا لَاسود علی احمر الّا بالتقوی[2]

”لوگو! خوب اچھی طرح سُن لو، تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ خوب اچھی طرح سن لو۔ نہ عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل ہے، نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر، اگر کسی کو کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر“۔

۳۔ یہ حقوق چونکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اس لیے کوئی انسان نہ انہیں منسوخ کرسکتا ہے، نہ ان میں کوئی تبدیلی کرسکتا ہے اور نہ انہیں معطل کرسکتا ہے۔

وَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللہِ...... (الانعام:۳۴)

”اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے“۔

کیسے بھی حالات ہوں ان حقوق پر دست درازی کی کسی کو اجازت نہیں ہے، حتیٰ کہ جنگ کے دوران دشمن فوجیوں اور قیدیوں کے انسانی حقوق پامال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

ضمانتِ حقوق کی اسلامی بنیادیں

مختلف ممالک کے دستوروں میں انسانی حقوق کی شمولیت اور بین الاقوامی منشورات اور

۱۔ صحیح بخاری کتاب الاحکام۔ باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول، صحیح مسلم کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل۔

۲۔ مسند احمد۔ ۴۱۱/۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعلانات کے باوجود وہ حکمرانوں کے دست برد سے محفوظ نہیں ہیں اور ہر جانب ان کی پامالی ہو رہی ہے۔ اسلام نے ان حقوق کے نفاذ اور ان کی ضمانت کے لیے بعض تحفظات فراہم کیے ہیں۔

۱۔ اسلام نے یہ تصور دیا کہ اقتدار و حکمرانی کا اصل حق اس ہستی کا ہے جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔۔۔ (الانعام:۵۷) "فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے"۔

حکمراں دراصل اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور اس کے اوامر و نواہی کا پابند ہوتا ہے۔ یہ تصور حکمراں کو آمریت کی راہ پر جانے سے روکتا ہے اور اپنی رعایا کے حقوق کے معاملے میں اسے سنجیدہ اور ذمہ دار بناتا ہے۔

۲۔ اس نے حکومت اور اس سے متعلق ذمہ داریوں کو "امانت" سے تعبیر کیا ہے۔ کوئی چیز جس شخص کے پاس امانت ہوتی ہے، اس میں وہ اپنی حسب خواہش تصرف کا اختیار نہیں رکھتا، بلکہ اس کے مالک کی مرضی کا پابند ہوتا ہے، اگر وہ اس سے ذرا بھی تجاوز کرے گا اور اپنی مرضی چلانے کی کوشش کرے گا تو خیانت کرنے والا اور ظالم ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

اذا ضیّعت الأمانت فانتظر الساعة "جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو"۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! امانت کا ضیاع کیسے ہوگا؟ فرمایا:

اذا اُسند الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة[1] "جب لوگوں کے معاملے نااہل لوگوں کے سپرد کیے جانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو"۔

یہ تصور حکمران کو عوام کے حقوق کے معاملے میں بہت حساس بناتا ہے۔ وہ ان کی پاسداری کی پوری کوشش کرتا ہے اور اسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر اس معاملے میں اس سے ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو وہ خائن قرار پائے گا۔

۳۔ حکمراں کو کتاب و سنت پر عمل کا پابند کیا گیا ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب رفع الامانة

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ...... (الاعراف:۳)

''لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو''۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ...... (المائدۃ:۹۲، نیز دیگر مقامات)

''اللہ اور اُس کے رسول کی بات مانو''۔

کتاب وسنت اسلام کا دائمی دستور ہے۔ اس میں بیان کیے گئے حقوق ناقابلِ تنسیخ ہیں۔ حکمرانوں کو ان کا پابند کر کے حقوق کی ضمانت کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی گئی ہے۔ اگر کوئی حکمران کسی شخص کو ان میں بیان کیے گئے حقوق سے محروم رکھتا ہے یا کچھ ایسے احکام صادر کرتا ہے جو ان حقوق سے متصادم ہیں تو اس کے خلاف احتجاج کیا جاسکتا ہے اور اس کی کارروائی کو چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ اسلام کا تصورِ آخرت بھی حقوق کی حفاظت میں اہم کردار انجام دیتا ہے۔ اس کے مطابق انسان اس دنیا میں جو بھی اچھا برا کام کرتا ہے آخرت میں اسے اس کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس کا چھوٹے سے چھوٹا عمل اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے اور اسے نوٹ کیا جارہا ہے۔ آخرت میں اس کا نامۂ اعمال اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا اور اس کے مطابق اسے جزا یا سزا ملے گی۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۝ (الزلزال:۷:۸)

''پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا''۔

یہ تصور ہر مسلمان کو دوسروں کے حقوق کے معاملے میں بیدار اور حساس رکھتا ہے اور ان میں کوتاہی کرنے یا لوگوں پر ظلم وزیادتی کرنے سے روکتا ہے۔ یہ تصور خاص طور پر حکمرانوں کو اپنے فرائض کے معاملے میں بہت چوکنا رکھتا ہے۔ انہیں ہر لمحہ یہ ڈر رہتا ہے کہ اگر ان سے کچھ کوتاہی سرزد ہوئی اور ان کی رعایا میں سے کسی کا کوئی حق پامال ہوا تو قیامت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی باز پرس ہوگی اور اسے رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ حضرت ابوذر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غفاریؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ''امارت'' کی نازک ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

اِنّھا اَمانۃ و انّھا یوم القیامۃ خزی وّندامۃ الاّمن اخذھا بحقّھا واَدّی الذی علیہ فیھا[1]	''یہ امانت ہے، اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث بنے گی۔ اس سے صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو اسے حق کے ساتھ قبول کرے اور اس کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری ٹھیک طریقے سے ادا کرے''۔

۵۔ عوام کو حق دیا گیا کہ وہ اپنے حکمرانوں کا احتساب کرتے رہیں۔ اگر وہ انہیں فرائض کی انجام دہی اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہوئے پائیں تو متنبہ کریں، انہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ اور اگر وہ اپنی اصلاح نہ کریں تو انہیں ہٹا کر کسی دوسرے کو زمامِ حکومت سونپ دیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے ایک مجمع میں فرمایا: ''اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کروں تو تم لوگ کیا کرو گے؟ ایک صحابی نے اٹھ کر کہا: اگر ہم نے تم میں کوئی کمی دیکھی تو اپنی تلواروں سے تمہیں سیدھا کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے خوش ہو کر فرمایا: الحمدللہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ میں کج ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دیں گے''[2]۔ اسلام کی تاریخ ایسی مثالوں سے پُر ہے کہ حکمرانوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر انہیں ٹوکا گیا اور ان کی سرزنش کی گئی۔ اور انہوں نے خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا اور اپنی روش کی اصلاح کی۔

۶۔ اسلام میں عدلیہ ایک بااختیار ادارہ ہے۔ اسے انتظامیہ پر بالادستی حاصل ہے۔ حکمراں کی جانب سے کسی پر ظلم وزیادتی ہو یا کسی کا حق پامال ہو تو عدالت میں مُرافعَہ (اپیل، رجوع) کیا جا سکتا ہے اور عدالت اس کی شکایت پر کارروائی کرے گی اور اس کا حق دلوائے گی۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ان کے پاس ان کے کسی گورنر کے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب النہی عن طلب الامارۃ والحرص علیہا

[2] العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، سید قطب ص ۱۸۵

☆ اگر زباغ رعیت ملک خورد سیبے ... برآورند غلامان او درخت از بیخ ☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بارے میں کوئی شکایت آتی تو اسے اور شکایت کرنے والے کو روبرو کرتے، پھر اگر اس کی شکایت صحیح ہوتی تو اس گورنر کی گرفت کرتے تھے[۱]۔

ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر کسی گورنر کے بارے میں میرے پاس شکایت آئی کہ اس نے کسی شخص پر ظلم کیا ہے تو میں اس سے بدلہ لے کر رہوں گا۔ اس پر حضرت عمرو بن العاصؓ نے (جو مصر کے گورنر تھے) کہا: اے امیر المومنین اگر کوئی گورنر اپنی رعایا میں سے کسی شخص کی تادیب کے لیے اسے سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی بدلہ دلوائیں گے۔ فرمایا:

ای والذی نفسی بیده الاَقُصه، وقد رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم أقصّ من نفسه[۲]

''ہاں، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میں اس سے بدلہ دلواؤں گا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ (اگر کسی کو آپ کی ذات سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو) خود کو بدلہ کے لیے پیش کر دیتے تھے''۔

اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق

آج مغربی معاشرہ میں طویل جدوجہد کے بعد جو انسانی حقوق منظور کیے گئے ہیں اور جن کا مختلف ملکوں کے مسودۂ حقوق اور بین الاقوامی منشوروں کے مراحل سے گزرتے ہوئے اقوام متحدہ کے ذریعہ پیش کردہ عالمی منشورِ حقوق انسانی کی صورت میں اعلان کیا گیا ہے، اسلام نے صدیوں پہلے ان کا اعتراف کیا ہے اور اسلامی حکومتوں کے زیرِ سایہ طویل عرصہ تک عوام ان سے متمتع ہوتے رہے ہیں۔ یہاں ان حقوق کی طرف اجمالاً اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

۱۔ زندہ رہنے کا حق

اسلام ہر متنفس کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا

۱۔ تاریخ الرسل والملوک، ابن جریر طبری، دار المعارف مصر ۴/۲۰۴

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، باب القود من الضربة وقص الامیر من نفسه

☆ مگس جاہی نخواہد رفت بجز دکان حلوایی ☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اس کی جان کے درپے ہو۔ اس کے نزدیک کسی ایک شخص کو قتل کرنا پوری نوعِ انسانی کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا...... (المائدہ:۳۲)

''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا۔

قتل کرنے والا خواہ کوئی ایک شخص ہو یا بہت بڑی جمعیت، دونوں مجرم اور سزا کے مستحق ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو اجتمع اهل السلماء والارض علی قتل امرئ اسماء لعذبهم اللّٰه[1]

''اگر آسمان اور زمین کے تمام لوگ مل کر کسی ایک شخص کو قتل کر دیں تو اللہ ان سب کو عذاب دے گا''۔

اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم کسی کی تفریق نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لزوال الدنیا أهون علی الله من قتل رجل مسلم[2]

''پوری دنیا کا فنا ہو جانا اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل سے ہلکا ہے''۔

دوسری حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قتل معاهد الم یرح رائحة الجنة[3]

''جس شخص نے کسی ایسے غیر مسلم کو جس سے معاہدہ ہو، قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا''۔

اسلام کسی فرد کو پیدائش کے بعد ہی نہیں بلکہ رحم مادر میں پلنے والے جنین کو بھی زندگی کا حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ استقرارِ حمل کے بعد اسقاط کی اجازت نہیں دیتا۔ علمائے اسلام نے ایسا کرنے کو جرم قرار دیا ہے۔ بعض علماء نفخ روح کی مدت (۱۲۰ دن) سے قبل اسقاط کی

---

[1] طبرانی [2] جامع ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء فی تشدید قتل المومن

[3] صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ، باب اثم من قتل معاہداً بغیر جرم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجازت دیتے ہیں لیکن وہ بھی اسے مکروہ قرار دیتے ہیں[1]۔

۲۔ عزت واحترام کا حق

اسلام کے نزدیک ہر شخص محترم ہے، خواہ وہ سماج کے کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ کسی کو حق نہیں کہ اس کی ہنسی اڑائے، برا بھلا کہے، پیٹھ پیچھے برائی کرے، بہتان لگائے، اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھے یا اس کی تذلیل اور اہانت کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ......

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو......“

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا...... (الحجرات:۱۱۔۱۲)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے“۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من كانت له مظلمة لا حد من عرضه أوشئ فليتحلله منه اليوم قبل ان لا يكون دينار ولا درهم[2]

”جس شخص نے کسی کی بے عزتی کی ہو یا اس پر کچھ ظلم کیا ہو تو وہ آج ہی اس سے معاف کرالے اس دن سے پہلے جب روپیہ پیسہ نہ ہوگا کہ اس کے کچھ کام آئے“۔

ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا کسی شخص کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ اس کی ماں عجمی (حبشیہ) تھی۔ انہوں نے غصہ میں آکر اسے اس کی ماں کا طعنہ دیا۔ یہ بات آں حضرت صلی

---

[1] دیکھیے اسلام کا نظریۂ جنس، مولانا سلطان احمد اصلاحی، ادارہ علم وادب علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۶۔۳۰۰

[2] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب من کانت لہ مظلمۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اعیرتہ بامہ، انک امرؤ فیک جاھلیۃ[1] — ''کیا تم نے اسے اس کی ماں کا طعنہ دیا ہے؟ یہ تو جاہلیت کی بات ہے''۔

اسلام کے نزدیک یوں تو ہر شخص کی عزت وآبرو محفوظ ہے، لیکن خاص طور سے عورتوں کی عزت وناموس کی پاسداری کی تاکید کی گئی ہے اور ان پر بہتان لگانے والوں کے لیے سخت سزا متعین کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌo (النور:۲۳) — ''جو لوگ پاک دامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے''۔

اسلام لوگوں کی عزت وآبرو کو کتنا محترم سمجھتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی مرد یا عورت پر زنا کا بے بنیاد الزام لگانے کی سزا اسّی کوڑے مقرر کی گئی ہے اور انہیں ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمَانِیْنَ جَلْدَۃً وَّ لَا تَقْبَلُوا لَھُمْ شَھَادَۃً اَبَدًا...... (النور:۴) — ''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو''۔

۴۔ نجی معاملات میں رازداری اور پردہ داری

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی شخص کے نجی معاملات میں دخل اندازی کی جائے اور ان کی ٹوہ میں لگا جائے۔ قرآن کریم کا صریح حکم ہے:

وَّلَا تَجَسَّسُوْا...... (الحجرات:۱۲) — ''اور تجسس نہ کرو''۔

اسلام لوگوں کے تزکیۂ نفس پر زور دیتا ہے تاکہ ان کے دل اس حد تک پاکیزہ ہو جائیں کہ وہ گناہ اور معصیتِ الٰہی کی طرف مائل نہ ہوسکیں۔ تربیت وتزکیہ کے بغیر اگر لوگوں کو

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من امر الجاہلیۃ، صحیح مسلم کتاب الایمان، باب اطعام المملوک مما یاکل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برائیوں سے روکنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ انہیں چھپ کر کریں گے اور اگر ان کی خفیہ نگرانی کی جائے گی تو وہ ان کے ارتکاب کے دوسرے طریقے نکالیں گے۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

انک اِن اتبعت عوراتِ الناس افسدتھم او کدت ان تفسدھم[1] "اگر تم لوگوں کے پوشیدہ امور کی ٹوہ میں رہو گے تو انہیں بگاڑ دو گے یا بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے"۔

آپ ﷺ نے حکمرانوں کو بھی اس سے متنبہ کیا ہے اور انہیں لوگوں پر بلاوجہ شک وشبہ کرنے اور ان کی جاسوسی کروانے سے روکا ہے۔ آپ ؐ کا ارشاد ہے:

اِنّ الأمیر اذا ابتغی الریبة فی الناس أفسدھم[2] "اگر حکمراں اپنی رعایا کے ساتھ شک وشبہ کا معاملہ کرے گا تو انہیں بگاڑ کر رکھ دے گا"۔

اس معاملے میں اسلام اس قدر لحاظ کرتا ہے کہ بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے یا باہر سے تاک جھانک کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَھْلِھَا...... (النور: ۲۷) "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو"۔

حضرت سہل بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے گھر میں دروازے کے سوراخ سے جھانک رہا تھا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس سے سر کھجا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا:

لو اعلم انک تنظر لطعنت بہ فی عینیک، انما جعل الاستئذان من اجل البصر[3] "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس سے تمہاری آنکھ پھوڑ دیتا۔ اجازت لینے کا حکم اسی لیے تو دیا گیا ہے کہ قابلِ ستر چیزوں پر نگاہ نہ پڑے"۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس [2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس

[3] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل البصر، صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ

کم عاقل عاقل اعیت مذاھبہ ---- ☆ ---- و جاھل جاھل تلقاہ مرزوقا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ تعلیم کا حق

اسلام تحصیلِ علم پر بہت زور دیتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں جہالت عام تھی اور پڑھے لکھے لوگ خال خال تھے، پہلی وحی پڑھنے اور علم حاصل کرنے کے بارے میں اُتری:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ o خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ o الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ o (العلق:۱۔۵)

''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا''۔

احادیث میں بھی خود علم حاصل کرنے اور دوسروں کو علم سکھانے کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مان رجل یسلک طریقاً یطلب فیہ علماً الاسھّل اللہ لہ بہ طریقاً الیٰ الجنّۃ[۱]

''جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے کسی راستے پر چلتا ہے اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان بنا دیتا ہے''۔

حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنّ اللّٰہَ و ملائکتہ و اھل السماوات و الارضین حتی النملۃ فی جحرھا وحتی الحوت لیصلّون علی معلّم النّاس الخیر[۲]

''اللہ اس کے فرشتے اور آسمان اور زمینوں کی تمام مخلوقات، یہاں تک کہ چیونٹی اپنے بل میں اور مچھلی، لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والے کے لیے دعائے خیر کرتی ہیں''۔

اسلام علم کو مختلف خانوں میں بانٹ کر بعض کو پسندیدہ اور بعض کو ناپسندیدہ قرار نہیں دیتا، بلکہ ہر طرح کے علم کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے، لیکن وہ علم برائے علم کا قائل نہیں، بلکہ ایسے

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فی فضل العلم، صحیح بخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل (ترجمۃ الباب)

۲۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم کو پروان چڑھانا چاہتا ہے جس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

اللھم انی اعوذبک من علم لاینفع[1] ''اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جس سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے''۔

آپ ﷺ نے بے فائدہ علم کو بے مصرف خزانہ سے تشبیہ دی ہے۔ فرمایا:

ان مثل علم لا ینفع کمثل کنز لا ینفق فی سبیل اللہ[2] ''جس علم سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے وہ اس خزانہ کے مثل ہے جسے راہِ خدا میں خرچ نہ کیا جائے''۔

۵۔ اظہارِ رائے کا حق

اسلام نے عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنے پر زور دیا ہے۔ غور و فکر سے مختلف لوگوں کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہوتا ہے۔ اسلام حدود کے اندر اختلاف کی اجازت دیتا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ نے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ اور خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ، کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن دونوں نے ان سے تعرض نہ کیا، اس لیے کہ ان کی طرف سے کسی باغیانہ روش کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں خوارج نے ان کی اطاعت قبول نہیں کی۔ لیکن حضرت علیؓ نے بزور قوت انہیں سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ فرمایا:

قفوا حیث شئتم بیننا و بینکم ان لاتسفکوا دماً حراماً، او تقطعوا سبیلا، او تظلموا ذمة، فانکم ان فعلتم فقد نبذنا الیکم الحرب علی سواء[3] ''جہاں چاہو رہو، شرط یہ ہے کہ کسی کا ناحق خون نہیں کروگے، ڈاکہ زنی نہیں کروگے۔ اور ذمیوں کو قتل نہیں کروگے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر میں تم سے جنگ چھیڑوں گا''۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اپنی رعایا کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی دی ہے اور ان کے اس حق کو کبھی غصب نہیں کیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل [2] مسند احمد ۴۹۹/۲

[3] البدایة والنھایة، ابن کثیر، دار الریان للتراث، طبع اول ۱۹۸۸ء، ۲۹۱/۷-۲۹۲

☆ اعلمه الرمایة کل یوم...... فلما اشتد ساعده رمانی ☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ عقیدہ اور مذہب کے انتخاب کا حق

اسلام واضح کرتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ لیکن ساتھ ہی وہ انسانوں کو اس بات کی آزادی دیتا ہے کہ وہ جو عقیدہ اور مذہب چاہیں اختیار کریں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ...... (البقرہ:۲۵۶)

''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھی دی گئی ہے''۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (یونس:۹۹)

''اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن وفرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں''۔

اسلام اپنا غلبہ چاہتا ہے، لیکن طاقت اور جبر کے ذریعے نہیں، بلکہ دعوت وتبلیغ، افہام و تفہیم اور دلیل و برہان کے ذریعے۔ وہ حق اور باطل کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ پھر لوگوں کو پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ چاہے حق کو قبول کرلیں یا باطل پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ...... (الکہف:۲۹)

''صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے''۔

۷۔ تنظیم سازی کا حق

اسلام اجتماعی نظم قائم کر کے کسی کام کو انجام دینے سے نہیں روکتا، بشرطیکہ اس کا مقصد خیر وصلاح ہو۔ اسلام کا مزاج اجتماعیت پسند ہے۔ وہ نیکی و بھلائی اور فلاحِ عامّہ کے کاموں کو انفرادی سطح پر انجام دینے کے ساتھ ساتھ انہیں اجتماعی طور پر انجام دینے کو پسند کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ...... (آل عمران:۱۰۴)

''تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں''۔

یہی اصول ان تنظیموں پر بھی منطبق ہوگا جو جائز حقوق کی حفاظت اور شکایات و مسائل کے حل کے لیے قائم کی جائیں۔

۸۔ انصاف کا حق

اسلام میں قانون کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی شخص خواہ امیر ہو یا غریب، صاحب جاہ و منصب ہو یا عام آدمی، اپنے مذہب کا ہو یا کسی دوسرے مذہب کا ماننے والا ہو، سب کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ...... (النساء:۵۸)

''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔

وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى...... (المائدۃ:۸)

''کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔

آں حضرت ﷺ نے ایک موقع پر ایک صحابی کو چھڑی سے ٹوکا دیا جس سے اس کے چہرے پر معمولی زخم آ گیا، آپ ﷺ نے فوراً فرمایا تعال فاستقد[1] (آؤ مجھ سے بدلہ لو)۔

غسان کا سردار جبلہ بن ایہم طواف کر رہا تھا۔ دوران طواف اس کا کپڑا ایک بدو کے پیر سے دب گیا۔ اس نے اس بدّو کے تھپڑ مار دیا۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پہنچا۔ انہوں نے قصاص کا حکم دیا۔ جبلہ نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں سردار ہوں اور یہ ایک معمولی آدمی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، باب القود من الضربۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انّ الاسلام جمعک وایاہ، فلست تفضلہ الا بالتقوی[1]

''اسلام نے تمہیں اور اسے ایک درجے پر رکھا ہے، تمہیں اگر فضیلت حاصل ہوسکتی ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر''۔

اس معاملے میں اسلام نے عدل وانصاف کو یہاں تک ملحوظ رکھا ہے کہ حکمرانوں کو بھی عدالت میں حاضر ہونے کا پابند کیا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے زمانۂ خلافت میں فریق مخالف کی طرح عدالت میں حاضر ہوتے تھے۔

اسلام کی نظر میں ہر شخص بے گناہ ہے جب تک کہ اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔ ملزم کو اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ثبوت پیش کرنا الزام لگانے والے کے ذمے ہے۔ اور جرم ثابت ہو جانے کے بعد کوئی شخص سزا سے بچ نہیں سکتا، چاہے وہ کیسی بھی حیثیت کا مالک ہو۔ قبیلۂ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں نے سفارش کی کہ اس کی سزا معاف کردی جائے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

وایم اللہ لو انّ فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد یدھا[2]

''اللہ کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو محمد اس کا بھی ہاتھ کٹوا دیتا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اسلام ''مظلوم'' کو بلا قیمت انصاف فراہم کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں عدالت کی فیس اور وکلاء کے بھاری معاوضے ادا کر کے انصاف خریدا نہیں جاتا، بلکہ عدالت کے تمام مصارف حکومت برداشت کرتی ہے۔

(جاری ہے۔)

1۔ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، ۸/۶۶

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب کراھیۃ الشفاعۃ فی الحد، صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف وغیرہ والنہی عن الشفاعۃ فی الحدود

☆ ہر کہ دست از جان بشوید ..... ہر چہ در دل دارد بگوید ☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلسفہ سائنس کے مورّخ اے۔ایف چامر کی تحقیقات کا خلاصہ

ظفر اقبال

عہد حاضر میں سائنس کو اصل علم بلکہ العلم کا درجہ دیا گیا ہے، مارکس ازم جیسے مفروضات پر مبنی نظریے کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ سائنسی ہے، لہٰذا پیائش، مشاہدہ، شک، تجربہ اور تردید کے عناصر ترکیبی "Measurement, observation, Doubt experiment اور refutation" ہی علم کی بنیاد بن گئے اور یہ ظنی غیر یقینی، غیر معتبر علم ہی عہد حاضر میں "العلم" قرار پایا۔ کسی موضوع سے متعلق اصولوں کی نوعیت طے کرنے کے لیے کیے گئے مشاہدے، مطالعے اور تجربے سے ماخوذ منظم علم کو سائنس کہا جاتا ہے، یہ علم تجربے اور مفروضے کے لیے واقعات، اصول اور نتائج کی تحقیق و تنظیم کے لیے موثر ہے۔ سائنس عالم طبیعی کا منظم علم ہے جو منظم ترتیب کی اساس پر قائم فنی قابلیت یا ہنرمندی سے معمور ہے، یہ مشاہدہ، تجربہ، پیائش اور ان واقعات کی عمومی تشریح کے لیے ماخوذ کلیات پر مبنی عالم مادی و طبیعی کے رویے اور فطرت کے منظم مطالعے، فنی قابلیت و ہنرمندی کا امتزاج ہے بالفاظ دیگر سائنس وہ علم ہے جو صرف اور صرف طبیعی دنیا سے متعلق مشاہدے، تجربے، پیائش اور معلومات کے نظم اور ان سب کی تنظیم کا مجموعہ ہو۔ اس علم کا تحقیق، پڑتال، تکذیب، تجربہ، معائنہ اور تصدیق کے قابل ہونا ضروری ہو۔ یہ تمام معاملات سائنسی منہاج کے تحت ہی قابل تصدیق ہوں جو چیز ہمہ وقت خود تصدیق و توثیق کی محتاج ہو اور جس کی تردید و تکذیب بار بار تصدیق کے باوجود ہمہ وقت ممکن ہو، وہ علم مصدقہ علم کیسے ہو سکتا ہے۔ منظم علم کی اصطلاح سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، اگر سائنس منظم علم کا نام ہے تو کیا منظم جرائم کو بھی سائنس کے دائرے میں داخل کر لیا جائے؟ سائنٹفک اسٹرکچر پر کوہن کے نظریات کا نقد، پاپر، لے کاٹوش اور فیرابینڈ نے اپنے اپنے انداز سے کیا ہے، Feyerabend نے اپنے مضمون On the Critique of Scientific Reason میں لکھا ہے کہ کوہن نے سائنس کے دفاع میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منظم جرم اور آکسفورڈ کا فلسفہ بھی سائنس کے معیار پر پورا اترتا ہے، لہٰذا سائنس کہلا سکتا ہے۔ چامر کے الفاظ میں بحث کا خلاصہ پڑھیے:

"Kuhn's demarcation criterion has been criticized by Popper

☆ الی ابن یحیی الترياق من العراق للملسوع ☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

on the grounds that it gives undue emphasis to the role of criticism in science; by Lakatos because, among other things, it misses the importance of competition between research programmes (or paradigms); and by Feyerabend on the grounds that Kuhn's distinction leads to the conclusion that organized crime and Oxford philosophy qualify as science.'[1]

کیا قرآن سائنس کی طرح ایک منظم علم کا نام ہے؟ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ قرآن سائنسی علم ہے یا سائنٹفک میتھڈ کے معیار پر پورا اترتا ہے تو کیا یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قرآن قابل تکذیب ہے؟ کیوں کہ سائنٹفک میتھڈ وہ طریقہ ہے جس میں تکذیب وتردید کا امکان یقینی طور پر تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جس نتیجے، نظریے، اور اصول کو لازمی، حتمی، ابدی، یقینی اور ناقابل تغیر تسلیم کیا جائے اسے سائنس علم تسلیم نہیں کرتی وہ دائرہ علم سے باہر کی شے ہے۔ اس لیے قرآن وسنت اور اجماع نہ سائنسی علم کہلا سکتا ہے نہ سائنٹفک میتھڈ پر پورا اتر سکتا ہے کیونکہ ان کی تکذیب وتردید ممکن نہیں، قرآن سائنسی علم نہیں کیوں کہ یہ حقیقت مطلق کی جانب سے نازل کردہ علم کلی ہے۔ یہ لوح محفوظ پر ثبت ہے۔ اس علم میں شک، شبہے، تردید اور تکذیب کا ذرہ بھر امکان نہیں۔ قرآن صرف اسی وقت سائنسی ہوسکتا ہے جب ہم قرآن میں کسی بھی وقت تردید، تنسیخ، تکذیب یا ترمیم کے امکان کو تاریخ کے کسی بھی دور میں یقینی تصور کرلیں یہ یقین قرآن کو سائنسی علم کے دائرے میں داخل کرسکتا ہے۔ سائنسی علم وہ ہے جس پر یقین کے ساتھ شک کیا جاسکتا ہو یقینی شک ——— جہاں علم کا آغاز شک ہو اور انجام بھی ہمیشہ شک رہے شک سے ماوراء علم سائنس کی دنیا میں علم کہلانے کا مستحق ہی نہیں لہٰذا تمام دینی علوم، الہامی کتابیں، مذاہب، جو شک سے ماوراء علم مہیا کرتے ہیں سائنسی علم کے دائرے سے خود بخود خارج ہوجاتے ہیں۔ سائنس صرف قرآن کو ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مذہبی کتابوں اور مذہبی دعووں، مابعد الطبیعیاتی افکار اور فلسفے کو بھی علم تسلیم نہیں کرتی۔ سائنس کے بارے میں مغرب کے مختلف مفکرین کے افکار کا خلاصہ پڑھ لینے کے باوجود یہ سوال پھر بھی باقی ہے کہ اگر یہ سب علوم سائنس کی اقلیم سے باہر ہیں تو پھر خود سائنس کیا ہے؟ اس سلسلے میں فلسفۂ سائنس کے فلسفی چامر کا موقف پڑھیے:

Marxists are keen to insist that historical materialism is a science. In addition, Library Science, Administrative Science,

---

1. A. F. Chalmers, *What Is This Thing Called Science?: An Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*, U.S.A.:Open University Press , 1988, p. 109.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Speech Science, Forest Science, Dairy Science, Meat and Animal Science. and even Mortuary Science are all currently taught or were recently taught at American colleges or universities. Self-avowed "scientists" in such fields will often see themselves as following the *empirical* method of physics, which for them consists of the collection of "facts" by means of careful observation and experiment and the subsequent derivation of laws and theories from those facts by some kind of logical procedure. I was recently informed by a colleague in the history department, who apparently had absorbed this brand of empiricism, that it is not at present possible to write Australian history because we do not as yet have a sufficient number of facts. An inscription on the facade of' the Social Science Research Building at the University of Chicago reads, "If you cannot measure, your knowledge is meagre and unsatisfactory". No doubt, many of its inhabitants, imprisoned in their modern laboratories, scrutinize the world through the iron bars of the integers, failing to realize that the method that they endeavour to follow is not only necessarily barren and unfruitful but also is not the method to which the success of physics is to be attributed.

The mistaken view of science referred to above will be discussed and demolished in the opening chapters of this book. Even though some scientists and many pseudo-scientists voice their allegiance to that method, no modern philosopher of science would be unaware of at least some of its shortcomings. Modern developments in the philosophy of science have pinpointed and stressed

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

deep-seated difficulties associated with the idea that science rests on a sure foundation acquired through observation and experiment and with the idea that there is some kind of inference procedure that enables us to derive scientific theories from such a base in a reliable way. There is just no method that enables scientific theories to be proven true or even probably true. Later in the book, I will argue that attempts to give a simple and straightforward logical reconstruction of the "scientific method" encounter further difficulties when it is realized that there is no method that enables scientific theories to be conclusively disproved either.[1]

سائنس کے بارے میں عموماً یہ غلط فہمیاں عام ہیں کہ سائنس معروضی علم، عالمگیر، سچ اور آفاقی علم ہے اور ناقابل تردید حقیقت ——— سائنسی نتائج و تجربات کی تردید ممکن ہی نہیں ہے۔ اس موقف کی بلیغ ترجمانی درج ذیل نثر پارے میں کی گئی ہے:

Scientific knowledge is proven knowledge. Scientific theories are derived in some rigorous way from the facts of experience acquired by observation and experiment. Science is based on what we can see and hear and touch, etc. Personal opinion or preferences and speculative imaginings have no place in science. Science is objective. Scientific knowledge is reliable knowledge because it is objectively proven knowledge.[2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام مندرجہ بالا دعوے جھوٹے، کاذب، باطل، لغو، غلط، بے بنیاد، اور فی

---

1. A.F. Chalmers, *What is This Thing Called Science? An Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*.pXVi

2. Ibid., p.1

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الاصل سائنسی علم اور سائنٹفک میتھڈ سے کامل ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔اس جھوٹ کی حقیقت جاننے کے لیے P.K Feyerabend کی کتاب *Against Method* کا مطالعہ ضروری ہے۔مغرب کا اہم ترین فلسفی Hume اصول استقرا [induction] کی منطقی اور تجربی توجیہہ کو ناممکن تصور کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا۔ہیوم کی اصول استقرا پر تنقید Treatise on Human Nature Part-III میں دیکھی جاسکتی ہے۔رسل نے اپنی کتاب *Problems of Philosophy* کے باب چھ میں اس موضوع پر نفیس بحث کی ہے۔پاپر نے اپنی کتاب *Objective Knowledge* میں My Solution to the Problem of Induction کے زیر عنوان اصول استقرا پر بہترین روشنی ڈالی ہے لیکن عالم اسلام کے مفکرین ان مباحث سے ناواقف ہیں۔وہ ابھی تک سائنس کے اصول استقرا سے اسلام وسائنس کو ثابت کررہے ہیں۔

سائنس اور دوسرے علوم میں کوئی فرق نہیں،قدیم اساطیر اور Voodoo سائنس کی سطح پر ہی کھڑے ہیں۔سائنس کی عصر حاضر میں پرستش اسی طرح کی جارہی ہے جس طرح ماضی میں خدا کی عبادت کی جاتی تھی۔عہد حاضر مذہب سائنس [Religion of Science] کا عہد ہے جس طرح لوگ مذہبی عقائد اور ایمانیات پر کوئی سوال نہیں اٹھاتے بالکل اسی طرح سائنس کے ظنی،قیاسی،اساطیری نظریات کو مذہبی اعتقادات کا درجہ دے کر اس مذہب کی عالمگیر عبادت ہورہی ہے۔اس موقف کا ترجمان Paul Feyerabend ہے،اس کا موقف چامر کے قلم سے پڑھیے:

One reaction to the realization that scientific theories cannot be conclusively proved or disproved and that the reconstructions of philosophers bear little resemblance to what actually goes on in science is to give up altogether the idea that science is a rational activity operating according to some special method or methods. It is a reaction somewhat like this that has recently led philosopher and entertainer Paul Feyerabend to write a book with the title *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge* and a paper with the title "Philosophy of Science: A Subject with a Great Past". According to the most extreme view that has been read into Feyerabend recent writings, science has no special features that render it intrinsically superior to other

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

branches of knowledge such as ancient myths or Voodoo. A high regard for science is seen as the modern religion, playing a similar role to that played by Christianity in Europe in earlier eras. It is suggested that the choice between theories boils down to choices determined by the subjective values and wishes of individuals. This kind of response to the breakdown of traditional theories of science is resisted in this book. An attempt is made to give an account of physics that is not subjectivist or individualist, which accepts much of the thrust of Feyerabend's critique of method, but which itself is immune to that critique.[1]

ہیوم کے خیال میں سائنس کی عقلی توجیہہ ممکن ہی نہیں ہے اسے عقل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا، وہ سائنسی نظریات اور قوانین پر ایمان و یقین کو نفسیاتی عادتوں کے طور پر دیکھتا ہے، چامر کے الفاظ میں:

There are a number of possible responses to the problem of induction. One of them is a sceptical one. We can accept that science is based on induction and Hume's demonstration that induction cannot be justified by appeal to logic or experience, and conclude that science cannot be rationally justified. Hume himself adopted a position of that kind. He held that beliefs in laws and theories are nothing more than psychological habits that we acquire as a result of repetitions of the relevant observations.[2]

پاپر جیسا فلسفی تسلیم کرتا ہے کہ سائنس کوئی معروضی حقیقت [Objective Reality] نہیں، سائنس میں ہم اپنی غلطیوں [errors] سے سیکھتے ہیں سائنسی ترقی trial & error کے اصول کے ذریعے ہی ممکن ہے، کیونکہ مشاہداتی بیانات کے ذریعے منطقی طور پر آفاقی قوانین اور نظریے وضع کرنا

---

1. Ibid., p. xvii. 2. Ibid., p.19.

© rasailojaraid.com